(قسط ۲)

جدید مصلحین کی فکری خصوصیات

مظہر الدین صدیقی ☆ ترجمہ: نعیمہ نور، ایم۔اے، ایم۔ایس سی

یہ صاف ظاہر ہے کہ سندھی بلحاظ متنازعہ دو وفاداریوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ ایک طرف وہ ایک بین الاقوامی بلکہ خالص انسانی مذہب چاہتے ہیں جس میں تمام انسان برابر کے شریک ہوں دوسری طرف وہ اسلام کی برتری کو دوسرے مذاہب پر قربان کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اسی طرح بحیثیت ایک ہندوستانی قوم پرست وہ مشترکہ فلسفۂ زندگی کی بنیاد پر ہندوؤں اور مسلمانوں کو ساتھ ساتھ کام کرتے دیکھنا چاہتے ہیں لیکن دوسری طرف وہ یہ پسند نہیں کرتے کہ مسلمان اپنی اجتماعی شخصیت کو ختم کر دیں۔ سندھی وحدت الوجود کے اس لئے حمایتی ہیں کہ اس میں انسانیت کے اتحاد پر زور دیا گیا ہے اور اسے اقوام اور انسانیت کی مذہبی تفریق سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ اس وسیع الخیال نظریے کے حامل ہیں جس میں صوفیوں کو خاص حیثیت حاصل ہے لیکن جو صرف آپس کے شخصی تعلقات کے لئے موزوں ہے اور فرقوں اور قوموں کے لئے استعمال کرنا مشکل ہے۔ وہ عالمگیر مذہب پسند کرتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ عالمگیریت بذاتِ خود کوئی قدر نہیں ہے گو یہ تمام اقدار کا منبع ہے قدر حد بندی اور تخصیص سے اخذ کی جاتی ہے پس جب کبھی ایک گروہ یا فرقہ عالمگیر اقدار کی بنیاد پر یا تمام انسانیت کی بھلائی کی خاطر منظم کیا جاتا ہے تو یہ اپنی ایک خاص یا نمایاں ہستی قائم کر لیتا ہے۔ اس گروہ میں شامل لوگ دوسروں سے مختلف خیال کئے جاتے ہیں۔ عالمی نکتہ نظر کے حامل گروہ کے لئے بھی جو ایک مشترکہ مقصد کے لئے کام کر رہا ہو ایک حد تک مخصوص ہونا ناگزیر ہے وہ دوسرے گروہوں سے تعاون کر سکتا ہے لیکن اپنی شخصیت کو دوسروں میں گم نہیں کر سکتا۔ صوفیانہ عالمگیریت نے اسلام کے وجود کو بحیثیت ایک سماجی و سیاسی ہستی کے خطرے میں ڈالا اور اسی کے خلاف علماء نے عمل کیا۔ حقیقت میں صوفیانہ عالمگیریت اور اسلام کے سماجی و سیاسی نصب العین کو یکجا کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ مسلمانوں میں وسیع النظری پیدا کی جائے اور ان کے تعصب کو اس مسلسل یاد دہانی سے کہ اسلام تمام انسانیت کی بھلائی چاہتا ہے اور صرف مسلمانوں کے مادی مفاد میں دلچسپی نہیں رکھتا نرم کیا جائے۔

اقبال کے برعکس سندھی کو یہ اعتراف کرنے میں کوئی ڈر نہیں کہ مسلمانوں نے اپنے تصوف کی ترقی میں دوسری

قوموں سے بہت کچھ سیکھا۔ سندھی فرماتے ہیں کہ یہ کہنا غلط ہے کہ اسلامی تصوف کا ہندو فلسفہ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ علوم اسلام سے قبل موجود تھے۔ مسلمانوں نے انہیں ایک ترتیب دی ان میں اضافہ اور تجدید کی اور ایک ایک نئی روح پھونکی، وہ لوگ جو یہ سوچتے ہیں کہ ان کی سائنس دوسروں سے مختلف ہے، ان کی ثقافت کا دوسری ثقافتوں سے کوئی واسطہ نہیں، ان کی حکمت خصوصی ہے، ان کا علم ایک کنواری زمین کی پیداوار ہے وہ دوسروں پر تو اثر انداز ہوتے ہیں لیکن ان پر کوئی اثر انداز نہیں ہوا اس قسم کے لوگ ہیں جو صرف اپنے ہم مذہبوں کی تحریر کردہ کتابیں پڑھتے ہیں اور انہی سے تعلقات قائم کرتے ہیں۔ غرض وہ نہ تو دوسروں کی سائنس کا مطالعہ کرتے ہیں اور نہ مختلف نظریات کے حامل لوگوں سے ملتے ہیں۔ ان کے ان تمام دعووں کی وجہ یہ ہے کہ ان کا دائرہ علم بے حد محدود ہے۔

بہر حال سندھی بھی جو تصوّف کے عظیم حمایتی ہیں ایک لحاظ سے اس پر نکتہ چینی کرتے ہیں یعنی یہ کہ تصوّف معاشی عناصر کی اہمیت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ عام طور پر تصوّف فلسفۂ اخلاقیات سے شروع ہوتا ہے۔ اس اعتراف کے باوجود کہ معاشی ضروریات کا حیوانی زندگی میں بہت دخل ہے اس نے کبھی انسانی زندگی کے اس پہلو پر توجہ نہیں دی۔ سندھی لکھتے ہیں کہ اسی وجہ سے ہماری سیاست ایک خالی خول بن کر رہ گئی۔ ہمارے ذہین ترین صوفیوں نے جنہوں نے اخلاقیات کی اعلیٰ منازل طے کیں، اجتماعی سیاست سے علیحدگی کو عقلمندی کا کمال تصوّر کیا۔ تصوّف پر کتابیں لکھنے اور تدوین کرنے والوں کو کبھی اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ اخلاقی زندگی کے لئے معاشی عناصر کی کیا اہمیت ہے یا معاشیات اور اخلاقیات میں مسلسل باہمی تعامل کی کیا اہمیت ہے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم تصوف کے ایک اور جدت پسند حامی ہیں جو مستشرقین کے اس نظریہ پر نکتہ چینی کرتے ہیں کہ تصوّف اسلام کے لئے خارجی حیثیت رکھتا ہے یعنی وہ بدھ مت یا ویدک فلسفہ سے اسلام میں داخل ہوا۔ ڈاکٹر حکیم کہتے ہیں کہ ان ماہرین کا مقصد اسلام کو محض ایک خشک اور سطحی قسم کا مذہب ثابت کرنا ہے جس میں خیالات و جذبات کی گہرائی کی کمی ہے۔ ”مسلمان مفکر جو یونانیوں سے متاثر ہوئے اور صوفی جنہوں نے ترکِ دنیا کا درس دیا اسلام میں حکمت اور روحانیت لانے کا باعث بنے۔ ہم نے اس کا پہلے ہی جواب دیدیا ہے اگرچہ لفظ عشق قرآنِ پاک میں استعمال نہیں ہوا لیکن یہ نظریہ ان دنوں میں جب قرآن نازل ہوا دوسرے الفاظ میں بیان کیا گیا تمام اسلام کی بنیاد ہی حُبِ خدا اور حُبِ پیغمبر پر رکھی گئی“

ڈاکٹر حکیم اس بات کے معترف ہیں کہ گوشہ نشینی کا مقصد افراد کے کردار و اخلاق اور قوموں کی زندگی میں انقلاب لانا تھا۔ خدا کے دھیان میں غرق رہنے کا مقصد جمالیاتی سرور حاصل کرنا نہیں تھا، اگر ایک انسان کا عشق ایک ایسی

نئی دنیا کو جنم نہیں دیتا جو قدیم اطوار زندگی کو ختم کردے تو یہ عشق کوئی انقلاب برپا نہیں کرے گا اور محض روحانی سرور حاصل کرنے کی ایک صورت ہوگی، ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی بھی صوفی نے کبھی اسلامی معاشرے یا قوم کی زندگی میں کوئی انقلاب برپا نہیں کیا۔

اقبالؔ کے نظریہ عشق پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر حکیم کہتے ہیں کہ اقبالؔ کا نظریہ عشقِ خدا حبِ انسانی کے خلاف نہیں ہے بلکہ اس کا بہترین مظہر انسانوں کی ایک دوسرے سے باہمی محبت ہے، لیکن کچھ صوفی عشقِ خدا میں اس قدر کھو گئے کہ انہیں انسانوں کی فلاح و بہبود سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ حالانکہ عشقِ خدا کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تخلیق کے تمام پہلوؤں سے بھی محبت کی جائے "تذکرہ اولیا میں غیر اسلامی تصوف کی بہت سی مثالیں ہیں ایک صوفی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہیں اپنے عزیز بیٹے سے اس قدر محبت تھی کہ انہیں یہ فکر لاحق ہو گئی کہ یہ محبت ان کی حبِ خدا پر اثر انداز ہوگی چنانچہ انہوں نے دعا مانگنی شروع کی کہ ان کے دل سے بیٹے کی محبت ختم ہو جائے۔ غرض اسلام اس قسم کی ذہنی و خیالی روحانیت سے پرہیز کرنے کی تلقین کرتا ہے"

تقلید کے خلاف ردِ عمل:-

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے مسلمان تجدد پسند اپنے سماجی نظام کو قدیم یا خالص اسلام کے خطوط پر تعمیرِ نو کے خواہش مند تھے لیکن ان کے اور قدیم اسلام کے درمیان ازمنہ وسطیٰ کا وہ علمِ دین اور علم فقہ حائل تھا جو اسلام کی ایک خالص انسانی اور اس لئے غیر یقینی تشریح و توضیح تھی جو وقت کے عناصر یعنی اس وقت کی سماجی اور معاشی حالات سے اثر انداز بھی ہوئی اور وقتی تقاضوں کے زیر اثر کی گئی۔ پھر کس طرح ایک نیا معاشرہ ازمنہ وسطیٰ کے فقہا اور علماء کے خیالات پر بنایا یا چلایا جا سکتا ہے جب کہ ان کا پس منظر اور سماجی نظام بہت مختلف تھا۔ ان حالات میں ازمنۂ وسطیٰ کی طاقتوں کی تقلید کے خلاف زبردست احتجاج ہوا۔ سرسید احمد خان نے اس اعتراض کو یوں بیان کیا۔ "لوگوں نے اپنے آباؤ اجداد کی رسومات اور دوسری روایات کو خدائے واحد کے ساتھ ایک اور خدا کی حیثیت دیدی ہے ۔ اسی طرح پیغمبر محمدؐ کے ساتھ اور بہت سے پیغمبر بنا لئے ہیں اور قرآن کے ساتھ دوسرے بہت سے قرآنوں کو تسلیم کر لیا ہے ۔ ہم اس غلط خدا، فرضی پیغمبروں اور نقلی قرآنوں کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو ہمارے جدِ امجد ابراہیمؑ نے اپنے باپ کے بتوں کے ساتھ کیا تھا اور ہم اس دنیا میں ایک حقیقی خدا، اس کے پیغمبر محمدؐ اور اس کی سچی کتاب کی تابعداری کو دوبارہ قائم کریں گے"

دوسرے مصلحوں نے اس قدر جوش و خروش کا اظہار نہیں کیا پھر بھی ازمنہ وسطیٰ کی طاقتوں کو رد کرنے کا رجحان یقینی ہے ۔ محمد عبدہ لکھتے ہیں کہ یہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اسلاف یا اخلاف کے توسط کے بغیر قرآن اور سنت

کے ارشادات کو اپنائے یا ان سے رجوع کرے۔ اسلام آباؤ اجداد کی غلامانہ تقلید کو پسند نہیں کرتا جو روایتی طور طریقوں کے پابند رہنائے مذہب کی خاصیت بیان کرتی ہے۔ اسلام انسانی ذہن سے روایتوں کی قوت اور ان کے گہرے نقوش کو ختم کرنے کی انتھک کوشش کرتا ہے غرض اسلام نے قوموں کے عقائد سے تقلید کی اہم بنیادوں کو پاش پاش کیا۔ قرآن ہمیں کائنات کے مظاہرات اور دوسری خاص چیزوں میں عقلی و استدلالی عمل اور تحقیقات کی دعوت دیتا ہے تاکہ جن چیزوں کی طرف قرآن ہماری رہنمائی کرتا ہے ہمیں ان کے متعلق یقین کامل ہو جائے۔ اسلام غلامانہ ضعیف الاعتقادی سے منع فرماتا ہے اور ہماری تحریک کے لئے ان لوگوں کے اخلاق کی مثال پیش کرتا ہے جنہوں نے محض اپنے باپ دادا کی پیروی میں سرور اطمینان حاصل کیا لیکن آخرکار ان کے عقائد اور وہ خود بحیثیت ایک قوم کے نیست و نابود ہو گئے۔ مندرجہ ذیل پیرے میں محمد عبدہ مسلمانوں میں دنیوی رجحانات کی مذمت کرتے ہوئے اس اہم حقیقت پر زور دیتے ہیں کہ آنے والی نسلیں مذہبی معاملات میں اپنا فیصلہ دینے کی کم نہیں بلکہ زیادہ اہلیت رکھتی ہیں۔

"اسلام نے مذہبی طاقتوں کی پوری قوت سے مخالفت کرتے ہوئے ان کے اس اقتدار کو ختم کیا جس کے ذریعے وہ اپنے احکامات اور ممنوعات صادر کرتے تھے اور ان لوگوں کے سامنے جواب دہ بنایا جن پر وہ مسلط تھے تاکہ وہ اپنے نظریات اور فیصلوں کی روشنی میں ان کے دعوؤں کی تحقیقات کریں اور ان کی حرکات و سکنات پر نگاہ رکھیں پس اس طرح وہ قیاس اور فریب پر مبنی نتائج اخذ نہیں کریں گے بلکہ یقینی فیصلہ کریں گے" اس کے علاوہ اسلام نے ایسے رویہ کو جو ہمیشہ سابقہ روایات معلوم کرنے کی کوشش کرے بیہودہ اور بیوقوفانہ قرار دیتے ہوئے اس سلسلے میں انسان کی ہمت افزائی کی کہ وہ اپنے باپ دادا کی دنیا اور ان کے ورثہ سے وابستگی کو ختم کر دے۔ محض وقتی لحاظ سے مقدم ہونا اعلیٰ ذہن اور قابلیت اور تصوری علم کی علامت نہیں ہے۔ بے شک اسلاف اور اخلاف فہم و ادراک اور دماغی صلاحیتوں کے لحاظ سے زیادہ مختلف نہیں ہوتے لیکن اخلاف کو اپنے اسلاف پر یہ برتری حاصل ہے کہ وہ گزرے ہوئے واقعات بھی جانتے ہیں اور اب ان واقعات کے نتائج و اثرات کا مطالعہ بھی کر سکتے ہیں اور ان سے مستفیض ہو سکتے ہیں۔"

ان مذہبی طاقتوں کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے عبدہ خاص طور پر مسلمان فقہا کا ذکر نہیں کرتے لیکن ان کے شاگرد علامہ رشید رضا یہاں خاص طور پر لکھتے ہیں کہ ہم نے متاخرین فقہا کی لکھی ہوئی کتابوں پر مکمل بھروسہ کر لیا ہے جنہوں نے یہ کتب اپنے اماموں کے بتائے ہوئے اصولوں کی مدد سے لکھیں چنانچہ جو کچھ وہ کہتے ہیں اسے تسلیم کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں اور قرآن و سنت سے سوائے برکت حاصل کرنے کے دوسرے معاملات میں غور و فکر کو ضروری نہیں سمجھتے۔ اب اگر فقہا کے فیصلے اور قرآن یا سنت کے بیان میں کوئی فرق یا تضاد ہے جو ہم نہیں سمجھ

پلتے تو اس کیلئے فقہا کو اس الزام سے بری کرتے ہوئے ہم اپنی ہی ذہانت کو قصور وار گردانتے ہیں۔

طٰہٰ حسین ممتاز فقہا کی لکھی ہوئی کتب پر شروح، تبصرے، خلاصے اور دوسرے مختصر اشارات لکھنے کے رواج کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان تبصروں وغیرہ نے سوائے وہی پہلی باتیں دہرانے کے کسی نئے علم یا معلومات کا اضافہ نہیں کیا۔ پھر جب علماء نے اپنی ذہانت کا استعمال بند کر دیا تو ان کے شاگردوں پر بھی جمود طاری ہو گیا اور جو کچھ اس نے اپنے شیخ سے سنا اسے طوطے کی طرح دہرا دیا اور کبھی کسی نئے نکتہ کو کو معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔

سر سید کے ہم عصر اور ساتھی محسن الملک مسلمانوں میں اسی ذہنی وعقلی تحقیق کی کمی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "آپ کی مذہبی تحقیق ان لوگوں کے بیان کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے جو آپ کی طرح خطا پذیر ہیں اور جن کی آرا میں غلطی کا اسی قدر امکان ہے جتنا آپ کی اپنی رائے میں۔ آپ کے مذہبی عقائد براہ راست قرآن پر مبنی نہیں ہیں بلکہ دوسرے لوگوں کی رائے اور ارشادات سے اخذ کئے گئے ہیں۔ قانونی فیصلوں اور شریعت کے احکامات کے لئے بھی آپ پیغمبر کے قول و فعل سے رہنمائی حاصل نہیں کرتے بلکہ جو کچھ دوسروں نے لکھ دیا اسے خدائی احکام سمجھتے ہیں"

سر سید کے ایک اور ہم عصر ساتھی حالی اس بات کے شاکی ہیں کہ تقلید نے مذہبی معاملات میں مسلمانوں کو نہ صرف بے بس کر دیا ہے بلکہ سائنس، تجارت اور زراعت وغیرہ میں ان کی ترقی کو بھی روک دیا ہے۔ حالی مزید کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا عام رجحان یا رویہ یہ ہے کہ جو کچھ ان کے آباؤ اجداد نے کیا وہ بہترین تھا وہ تمام ذہانت اور عقلمندی کے مالک تھے لیکن بعد کی نسلوں کو اس فہم و ادراک میں سے کوئی حصہ نہیں ملا بعد میں آنے والوں کے لئے موقع نہیں چھوڑا گیا جہاں وہ اپنی انسانی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکیں۔ اسی تقلید کی وجہ سے مسلمان ترقی نہیں کر پاتے۔

علامہ اقبال بہر حال اسلاف کی پیروی اور تجدد پسندی دونوں کے قائل ہیں۔ فلسفیانہ مرحلے پر وہ زندگی میں جدت طرازی کے حامی ہیں لیکن جب سماجی رسومات، قوانین اور اصولِ زندگی کا سوال درپیش ہو تو وہ سختی سے آباؤ اجداد کی پیروی کرتے ہیں۔ اور یہاں ان کے لئے ماضی کو بھول جانا قوم کی زندگی کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ پیام مشرق میں اقبال کہتے ہیں:۔

تراش از تیشہ خود جادہ خویش   براہ دیگران رفتن عذاب است
گر از دست تو کارِ نادر آید   گناہے ہم اگر باشد ثواب است

ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا — منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

یہ اقبال کے خیالات کا ایک پہلو ہے پھر بھی اقبال فرماتے ہیں "شعورِ محبت کی شراب سے پیدا ہوتا ہے حضرت بایزید بسطامی نے جو اتباعِ سنت کے دلدادہ تھے خربوزہ کھانا چھوڑ دیا کیونکہ انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ پیغمبرِ اسلامؐ نے یہ پھل کس طرح کھایا۔ محبت محبوب کی تقلید سے مضبوط ہو جاتی ہے خدا بذاتِ خود اس کا شکار ہو سکتا ہے"

یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال پیغمبر اسلامؐ کی تقلید کی وکالت کر رہے ہیں جو عظمت حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے اور بے شک یہ سچ ہے۔ لیکن اقبال نہ صرف پیغمبر کی تقلید بلکہ ازمنہ وسطیٰ کے فقہا کے فیصلوں کی تقلید بھی چاہتے ہیں۔ اسرار و رموز میں کہتے ہیں :۔

اجتہاد اندر زمانِ انحطاط — قوم را برھم ھمی پیچد بساط
ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر — اقتدا بر رفتگان محفوظ تر
عقلِ آبایت ہوس فرسودہ نیست — کارِ پاکان از غرض آلودہ نیست

یعنی دورِ زوال میں اجتہاد ملّت کے اتحاد کو توڑ دے گا۔ تنگ نظر عالموں کے اجتہاد کی پیروی کرنے سے یہ امر زیادہ محفوظ ہو گا کہ ہم اپنے آباء و اجداد کے طور طریق کو اپنائیں۔ تمہارے آباء و اجداد کی ذہانت و استدلال میں خود غرضی شامل نہیں تھی مقدس لوگوں کے کاموں میں ذاتی مفاد کی ناپاکی نہیں ہوتی۔"

یہ صاف ظاہر ہے کہ اقبال ترقی کے مقابلے میں استحکام چاہتے ہیں۔ بلا شبہ یہ حقیقت ہے کہ زوال کے زمانے میں اجتہاد خطرناک ہے لیکن یہ امر واضح نہیں ہے کہ ہم کس طرح اس دور سے نکل کر ترقی و عظمت کی راہ پر گامزن ہوں جب کہ ایک مرتبہ ذہانت کا استعمال ممنوع ہو جائے اور استدلال بے حس کر دیا جائے۔ کیا استدلالی عمل سے انکار کرنا اور ذہانت کو اس کے حقیقی کام سے روکنا خطرناک نہیں ہے؟ اس قوم کا کیا انجام ہو گا جو اندھا دھند اپنے آباء و اجداد کی پیروی کرے اور کل کے متعلق نہ سوچے؟ یہ بھی سچ ہے کہ ہمارے عظیم اسلاف کا استدلال ذاتی دلچسپی یا خود غرضی سے ناپاک نہیں ہوا لیکن انہوں نے جو کچھ کیا یا سوچا وہ ایک خاص پس منظر کا نتیجہ تھا اور اس لئے ہمارے دور میں اس پر عمل نہیں ہو سکتا۔

عقل اور اس کی محدودیت :۔

مسلمان تجدد پسندوں کی تقلید کو رد کرنے سے یہ سوال پیدا ہوا کہ مذہبی امور میں کس حد تک عقل و استدلال کا استعمال کیا جائے۔ جہاں تک ایک معاملہ وحی کے ذریعے طے ہو گیا اس میں استدلال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

لیکن وحی کے مختلف مفہوم ہو سکتے ہیں اور وحی سے اخذ کئے گئے چند قوانین ایسے ہو سکتے ہیں جہاں استدلال اپنا کردار ادا کر سکے۔ چنانچہ حلقۂ استدلالی کی حدود مقرر کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ عام طور پر سب ہی تجدد پسند مسلمان انسانی استدلال کی حدود کا ذکر کرتے ہیں لیکن کہیں بھی اس کی صحیح تعریف نہیں ملتی۔ محمد عبدہ کہتے ہیں کہ چیزوں کی اصلیت کا علم انسانی دماغ کے لئے ناممکن ہے ہمارا ذہنی استدلال زیادہ سے زیادہ حادثات اور اثرات کا علم حاصل کر سکتا ہے۔ اب یہ سوال کہ آیا خدا کی صفات اور اس کی ذات الگ ہیں اور اسی قسم کے دوسرے جدالی مسائل انسانی ذہن کی پہنچ سے بالاتر ہیں اور بہت سے عمل ایسے ہیں جن کی افادیت معلوم کرنے کے لئے انہیں صحیح طور پر سمجھنا ناممکن ہے۔ مثال کے طور پر کئی معاملات میں دعا مانگنے کی رسومات یا حج کی رسومات' مذہب سے متعلق دوسری بہت سی تقریبات' اس کے علاوہ عیسائی مذہب کی رسمیں اور شفاعت کیلئے دعا مانگنا وغیرہ۔ انسانی ذہن ان تمام قسموں کی عبادت کی افادیت کو نہ تو سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی ان کی وضاحت کر سکتا ہے۔

اسی طرح عبدہ کہتے ہیں کہ شریعت کے بیان کے مطابق مذہبی احکامات کو ادا کرنے کا فرض اور ممنوعہ باتوں سے پرہیز کرنا علم کا ایک اور مجموعہ ہے جو صرف عقل کے ذریعہ سمجھ میں نہیں آتا۔

جہاں تک شریعت کے مفہوم کا تعلق ہے عبدہؔ استدلال کو اس کا پورا حق دینے کے لئے تیار ہیں "سوائے چند کے عام طور پر تمام مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ عقل اور نقل کی تکرار میں وہی بات تسلیم کی جاتی ہے جو عقل کے مطابق ہو، نقل کے سلسلے میں دو طریقے اپنائے جا سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ نقل کو صحیح تسلیم کر لیا جائے اور یہ اعتراف بھی کیا جائے کہ عقل اس کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ نقل کو لغت کے قوانین کی روشنی میں احتیاط سے سمجھا جائے یہاں تک کہ اِس کے معنی اور جو کچھ عقل نے ثابت کیا اُس میں کوئی فرق نہ ہو۔"

عبدہ دوبارہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مخلوقات کے مطالعے میں اسلام عقل کے استعمال کی جو ہدایت کرتا ہے وہ کسی طرح بھی محدود یا شرائط کی پابند نہیں ہے۔ یہ بات واضح نہیں ہے کہ مخلوقات سے عبدہ کا کیا مطلب ہے۔ کیا اس میں اسلام کی سماجی قانون سازی شامل ہے؟ عبدہ نے عقل و نقل کے سلسلے میں جو کچھ کہا ہے ہم اس سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ وہ سماجی قانون سازی کو بھی مخلوقات میں شامل کرتے ہیں دینی سطح پر عبدہ عقل کو پورا اختیار دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ قرآن کو محض اپنے بیان کی بنیاد پر اپنے مندرجات کے لئے ہماری منظوری درکار نہیں ہے۔ اس کے برعکس قرآن دلائل اور شہادت پیش کرتا ہے۔ وہ مخالف

مکتبِ فکر ونظر کو مخاطب کرتا ہے اور ہر تنقید کو دلائل سے ثابت کرنے کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ قرآن عقل وفہم سے مخاطب ہے اس نے ذہن کو چوکنّا کیا۔ اس نے کائنات کیلئے ایک نظام مقرر کیا اصول وعقائد بنائے اور پھر اِن تمام چیزوں کی حقیقی تحقیق کی ہدایت کی تاکہ عقل قرآن کے دعووں اور پیغام کی صداقت کے متعلق یقین کرلے۔ لیکن سماجی اور قانونی سطح پر مقدس شریعت انسانی عقل کے استعمال کو محدود کردیتی ہے۔ "پس قوتِ عقل تمام ضوابط سے آزاد ہوگئی اور ہر قسم کی تقلید کی غلامی سے بھی باہر آگئی اس کا صحیح رتبہ بحال کردیا گیا تاکہ صرف خدا اور اس کی شریعت کے مطابق وہ فیصلے اور حکمت میں اپنا صحیح کام سرانجام دے۔ اس کی حدود میں اس کی سرگرمیوں پر کوئی پابندی نہیں اور اس کی تحقیقات کا سلسلہ ناتمام ہے"

چنانچہ سماجی قانون سازی اور قانون کے نفاذ کے سلسلے میں شریعت استدلالی عمل کے لئے بند کردی گئی ورنہ استدلال یا عقل اپنی تحقیقات کرنے کے لئے آزاد ہے۔ حقیقت میں عبدہ علماء پر تقلید کی بیماری سے متاثر ہونے کا الزام لگاتے ہیں "وہ یقین لاتے ہیں اور پھر ثبوت مانگتے ہیں لیکن صرف اس شرط پر کہ ثبوت ان کے عقیدے سے متفق ہو اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو وہ اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتے حقیقت میں وہ پوری قوت سے اس کی مخالفت کرتے ہیں"۔

عبدہ کے شاگرد رشید رضا کہتے ہیں کہ قرآن نے ہمیں بتادیا ہے کہ اہل الکتاب اس بات پر متفق ہیں کہ عقل اور مذہب ایک دوسرے کے مخالف ہیں اور عقل مذہبی کتاب کے دائرہ سے باہر جس کسی نتیجے پر پہنچتی ہے وہ سچ نہیں ہے وہ عقل کے حق میں دلیل پیش کرتے ہیں۔ ایک اور جگہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن اپنے پیروکاروں کو دلائل مانگنے کا درس دیتا ہے اور ہمارے متقی وپرہیزگار آباء واجداد نے اسی راستے کو اپنایا۔ انھوں نے خود بحث ومباحثہ کیا دوسروں کے دلائل سنے اور لوگوں کو بغیر دلیل کے کوئی بات تسلیم کرنے سے منع کیا۔ پھر بعد کی نسلیں آئیں انھوں نے تقلید کے متعلق ہر چیز کا فیصلہ کیا اور لوگوں کو اس کی پابندی کی تلقین کی انھیں بحث ومباحثے سے منع کیا (مذہبی معاملات میں) یہاں تک کہ اسلام جو حقیقت میں تھا اس کے برعکس ہوگیا۔

اس کے برعکس طٰہٰ حسین معتزلہ پر نکتہ چینی کرتے ہیں کیونکہ انھوں نے یونانی فلسفیوں کی پیروی کی اور اُن معاملات میں عقل پر بھروسہ کیا جو واضح طور پر دائرۂ عقل سے باہر تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ معتزلہ نے اس غلط سوچ کے ساتھ خدا کے اوصاف پر بحث کی کہ قرآن نے خود لوگوں کو خدا کے وجود پر غور وفکر اور مناظرہ کرنے کی ہدایت کی ہے اس لئے دوسرے فلسفیانہ اور ذہنی امور پر بھی بحث ومباحثہ کیا جاسکتا ہے۔ یونانی، عیسائی اور مسلمان فلسفیوں کے خیال میں عقل جس قوت ادراک سے معمور تھی طٰہٰ حسین کہتے ہیں کہ عقل ان خصوصیات سے عاری

ہے۔حقیقت میں انسانی عقل انسان کو عطا کی ہوئی بہت سی صلاحیتوں میں سے ایک صلاحیت ہے۔دوسری صلاحیتوں کی طرح اس کی قوت بھی محدود ہے پس جہاں یہ کئی چیزوں کو سمجھنے کی قوت رکھتی ہے وہاں بہت سی باتیں عقل سے بالاتر ہیں۔طہٰ حسین ان لوگوں پر بھی تنقید کرتے ہیں جو جدید سائنس اور قرآن کو ملانے کی کوشش کرتے کرتے ہیں، کیونکہ ان کے خیال میں مذہب کو خواہ جدید علوم سے ملایا جائے یا نہیں اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔دین یا مذہب خدا کی طرف سے دیا گیا علم ہے جس کی کوئی حدود نہیں ہیں جب کہ جدید علوم قدیم علوم کی طرح انسانی عقل کی حدبندیوں کی وجہ سے محدود ہیں۔

طہٰ حسین وحی میں اندھا اعتقاد رکھنے پر زور دیتے ہیں لیکن یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ انسان کو کس طرح ان معاملات میں بھی جو دائرہ مذہب میں آتے ہیں عقل و فہم کے استعمال سے روکا جاسکتا ہے۔عقل کے استعمال کیلئے صرف یہ شرط رکھی جاسکتی ہے کہ وہ ٹھوس حقائق سے تعلق نہ توڑے۔معتزلہ اس لئے قصوروار نہیں تھے کہ انہوں نے دینی مسائل میں عقل کا استعمال کیا۔اُن کی کمزوری یہ تھی کہ وہ صرف غور و فکر کرتے جس طرح ان سے پہلے یونانیوں نے کی تھی ان کی فلسفیانہ فکر کی بنیاد ٹھوس اور ناقابلِ انکار حقائقِ زندگی پر نہیں رکھی گئی تھی۔اقبالؔ معتزلہ پر اس سے بھی زیادہ گہری تنقید کرتے ہیں وہ کہتے ہیں "معتزلہ نے مذہب کو محض نظریات کا ایک نظام گردانا اور اس کو ایک اہم حقیقت کے طور پر نظر انداز کر دیا وہ یہ سمجھنے میں ناکام رہے کہ میدانِ علم میں۔سائنسی یا مذہبی۔خیالات کی ٹھوس تجربات سے خود مختاری یا آزادی ناممکن ہے" بعد کی نسلوں پر معتزلہ کے کوئی خاص تاثر نہ چھوڑنے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔اسلام بنیادی طور پر معاشرے اور تعمیر معاشرہ میں دلچسپی رکھتا ہے۔دینیات میں دلچسپی ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔معتزلہ نے کبھی انسانی معاشرے کے مسائل کے متعلق غور و فکر نہیں کیا جس کی وجہ سے ان کی دینیات زمانہ وسطیٰ کے اسلامی دور میں سماجی قانون سازی پر اثر انداز نہیں ہوئی۔انہیں اپنے دینیاتی خیالات میں سماجی قانون سازی کو بھی شامل کرنا چاہیئے تھا۔انسانی زندگی میں عقل کی اہمیت سے اقبالؔ پوری طرح باخبر ہیں وہ کہتے ہیں کہ انسانیت کے دورِ نابالغی میں جذباتی یا روحانی قوت سے الہامی شعور پیدا ہوتا ہے۔یہ فرد کے خیالات اور انتخاب کو تیار شدہ فیصلوں، پسند اور طریقہ ہائے عمل کے ذریعے مختصر کرنے کا ایک طریقہ ہے۔لیکن عقل اور تنقیدی صلاحیت پیدا ہونے کے بعد زندگی خود اپنے مفاد کی خاطر شعور کے غیر استدلالی پہلوؤں کی ترقی و پیداوار کو روک دیتی ہے جس کے ذریعے انسانی ارتقاء کی ابتدائی منزل پر روحانی و جذباتی قوت پیدا ہوئی۔جذبات اور طبعی تحریکِ انسانی زندگی پر حکمران ہیں۔استقراری عقل جو انسان کو اپنے حالات کا حکمران بناتی ہے ایک کارنامہ ہے اس لئے اس کو برقرار رکھنا چاہیئے۔اقبالؔ مزید

کہتے ہیں کہ اسلام کے وجود پذیر ہونے سے استقراری عقل وفہم پیدا ہوئی۔ قرآن میں عقل و تجربہ سے مسلسل اپیل کی گئی ہے اور فطرت و تاریخ کو انسانی علم کا ماخذ قرار دیا گیا ہے۔ یہ ایک ہی خیال کے مختلف پہلو ہیں۔

بدقسمتی سے اقبال بھی صوفیوں کی غیر عقلیت سے متاثر ہوئے اس لئے اپنی شاعری میں وہ بعض اوقات عقل کو غیر اہم گردانتے ہیں اور انسان کی قوتِ عقل وفہم میں مکمل عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں:-

انجام خرد ہے بے حضوری ہے فلسفہ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت ہیں ذوق عمل کے واسطے موت

اقبال عقل اور عشق کا مقابلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عقیدہ اور ایمان جو عمل کے لئے لازمی محرک ہیں صرف عشق سے پیدا ہوتے ہیں۔

اقبال کا فلسفۂ عشق اور عقل کی اہمیت کو گھٹانا ان کے نظریہ مردِ مومن سے بہت گہرا تعلق رکھتا ہے اقبال ایسے مضبوط اور طاقتور رہنما چاہتے ہیں جو معاشرے کو انقلابی طور پر بدل دیں۔ الغرض دوسرے مصلحین کی طرح انہوں نے بھی اپنے ذہنی تصوّر کے خطوط پر مسلمان معاشرے کی تعمیرِ نو کی خواہش کی ہے لیکن پھر انہیں احساس ہوا کہ یہ تعمیرِ نو ایک یا ایک سے زیادہ مردِ مومن ہی کر سکتا ہے جس کے محرک اس کے عظیم ذہنی تصورات ہوں اور جس میں دنیوی خواہشات اور ذاتی مفاد کو ترک کرنے کی قوت ارادی ہو۔ اقبال کے خیال میں اس قسم کی شخصیتوں کی تخلیق و تشکیل میں عقل کا کوئی کام نہیں یہی نہیں بلکہ جب ایک نچلے مرحلے پر کسی سوچے ہوئے طریقۂ عمل کے فائدے اور نقصان کا اندازہ لگانے میں عقل کا استعمال ہوتا ہے تو وہاں عقل انسان کے عمل اور قوتِ فیصلہ کے لئے ایک اہم رکاوٹ بن جاتی ہے۔ لیکن عقل کسی طریقۂ عمل کے انتخاب میں اس کے نتائج کو ہمیشہ انسانی ذہن میں لاتی ہے۔ اس سے ذہنی تصوّرات یا آئیڈیل میں جھجک، قوتِ فیصلہ کی کمی اور رد کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ اقبال عشق کی حمایت کرتے ہوئے عقل کی اہمیت کو کم کر دیتے ہیں۔

لیکن اس سلسلے میں اقبال بہت سے اہم حقائق کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ سب سے پہلے تو صرف کم عقلی ہی انسان کو خالص مادی نفع و نقصان کے متعلق سوچنے میں مصروف رکھتی ہے لیکن ایک اعلیٰ مرحلے پر عقل ہمیشہ سوچے ہوئے عمل کے روحانی اور اخلاقی فوائد کو نمایاں کرے گی اور محرک ثابت ہوگی۔ دوسری بات یہ ہے کہ کوئی بھی فیصلہ خواہ مادی ہو یا روحانی اگر نفع و نقصان کے حساب پر مبنی نہ ہو تو وہ ایک اندھا فیصلہ ہوگا جو کسی عظیم انسان کے مشن کی تباہی اور ناکامی کا باعث ہوگا۔ تیسرا نکتہ یہ ہے کہ کسی کام کے لئے محض فیصلہ کر لینا کسی اہمیت کا حامل نہیں جب تک ہم اپنے مقصد کے حصول کے فیصلے میں صحیح ذرائع معلوم نہ کر لیں اور اس وقت صرف عقل ہی وہ

راستے بتاسکتی ہے جن کی ہمیں اپنے مقصد کے کامیاب حصول میں ضرورت پڑے گی اور آخر میں یہ اہم حقیقت نہیں بھولنی چاہیئے کہ انسانیت کی تاریخ میں کوئی کم عقل پیغمبر یا مصلح پیدا نہیں ہوا۔ تمام پیغمبر بلاشبہ نمایاں فہم و ادراک اور ایک جامع نظریہ کے مالک تھے ۔ان تمام حقائق کی روشنی میں انسان یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ اسلام کے معیاری تصورات کے مطابق معاشرے کی تعمیرِ نو میں عقل کی یہ ناقدری کس طرح مدد کرسکتی ہے ۔

اقبالؔ خود اس پہلو کی کمزوری سے واقف ہیں اور مندرجہ ذیل اشعار میں عقل کا ایک بہتر نظریہ پیش کرتے ہیں :-

"مغربی فرد کے لئے عقل ایک سریلا نغمہ ہے اور مشرقی فرد کے لئے عشق کائنات کا راز ہے۔عقل عشق کی مدد سے صداقت حاصل کرتی ہے، عقل کی مدد سے عشق کے کام کی بنیاد اور مضبوط ہوجاتی ہے جب عشق عقل کے ساتھ شامل ہوجاتا ہے تو یہ ایک دوسری دنیا کا نمونہ تیار کرتے ہیں اور آگے بڑھ کر اس دنیا کا سنگ بنیاد رکھتے ہیں عشق اور عقل آپس میں گھل مل جاتے ہیں ۔"

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم عقل کی حمایت کرتے ہیں اور اقبالؔ کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ عقل کے متعلق اقبالؔ کا اندازِ گفتگو یہ تاثر دیتا ہے کہ عقل خامیوں سے بھرپور ہے اس میں کوئی بھی خوبی نہیں ہے لیکن حقیقت میں عقل ایک صلاحیت ہے جسے اپنی حدبندیوں کا علم ہے ۔ڈاکٹر عبدالحکیم مزید کہتے ہیں کہ سقراط اور افلاطون کا عقلی استدلال حقیقت کے تصور سے بالکل خالی نہیں تھا جو زندگی کا ماخذ ہے لیکن جو ذہن اور فہم و ادراک سے بالاتر ہے ۔افلاطون نے اپنے فلسفہ میں EROS کا نظریہ قائم کیا موجودہ زمانے میں KENT نے خالص عقل پر اپنی CRITIQUE لکھی۔اس تصنیف کے بعد بہت کم مغربی فلسفیوں نے یہ نظریہ قائم رکھا کہ ذہن جو ظاہری حقائق سے نبٹنے کی اہلیت رکھتا ہے وہ زندگی کی مکمل گہرائیوں کو بھی ظاہر کرنے کے قابل ہے ۔

ڈاکٹر خلیفہ یہ امر بھی واضح کرتے ہیں کہ ممتاز مفکروں اور فلسفیوں نے آزادانہ ذہنی تحقیق کی جو جدوجہد کی اس کا محرک حُب صداقت تھا۔اگر سائنس دانوں اور فلسفیوں میں یہ حب صداقت نہ ہوتی تو ان کے لئے ایک غیر دلچسپ زندگی گزارنا ناممکن تھا، چنانچہ عشق اور علم توام ہیں ان کا تعلق کچھ اس قسم کا ہے کہ ان کے لئے ایک دوسرے کے بغیر کچھ کرنا ممکن نہیں ہے ۔

ڈاکٹر خلیفہ اس وضاحت کے لئے بھی فکرمند ہیں کہ انسان کے لئے اس کی جذباتی زندگی اتنی ہی اہم ہے جتنی اس کی عقلی زندگی۔ مذہب ہماری جذباتی اور عقلی زندگی دونوں کا خیال رکھتا ہے عقل کا یہ دعویٰ کہ وہ خود کفیل ہے اور اسے کسی دوسری طاقت کی مدد کی ضرورت نہیں ایک مضبوط دعویٰ نہیں ہے ۔وہ مزید لکھتے ہیں کہ مغرب نے زندگی کی ٹھوس چیزوں پر بہت سوچا۔اور انسان کے محدود مادی ذہن میں جو کچھ آیا مغرب نے اسے فتح کرلیا۔ لیکن فکر کے علاوہ ایک اور قیمتی صلاحیت بھی ہے جو "ذکر" کہلاتی ہے ۔ذکر زندگی کی باطنی دانش

یا الہام ہے جو آدمی کو اس کے ماخذ زندگی سے بہت قریب کردیتی ہے ۔ فکر زیادہ تر آدمی کی ظاہری زندگی سے دلچسپی رکھتی ہے لیکن ذکر دل کی زندگی ہے ۔ قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ذکر اور فکر دونوں پر زور دیتا ہے۔

دور حاضر کا ایک مفکر اور "ISLAM AT THE CROSS ROADS" کا مصنف محمد اسد عقل اور عقل پرستی میں گہرا فرق قائم کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ مذہبی امور میں عقل کے کردار کی نوعیت قابو کرنے والی ہے ۔ ہاں اور نہ کہنے کا اوزار' لیکن عقل پرستی کا معاملہ یہ نہیں ہے وہ قابو کرنے اور درج کرنے پر قناعت نہیں کرتی اور نہ ہی خالص عقل کی طرح یہ غیر جانبدار نہیں ہے بلکہ اس میں شخصی میلانات کا بہت زیادہ دخل ہوتا ہے ۔ عقل اپنی حدود کو جانتی ہے جب کہ عقل پرستی دنیا کو گھیرنے کا دعوی کرنے میں بعید از عقل ہے ۔ محمد اسد پیغمبر اسلام کی کورانہ پیروی پر زور دیتا ہے لیکن اس وضاحت کے ساتھ کہ "کورانہ پیروی کا مطلب قوتِ عقل کو خارج کرنا نہیں ہے اس کے برعکس ہمیں ان قوتوں سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے لیکن کسی بھی صورت میں خواہ ہم اس کے مقصدِ آخر کو سمجھیں یا نہیں ہمیں اس کے احکامات کو ماننا ہے ۔ میں اِس کو ایک سپاہی کی مثال سے واضح کروں گا جس کو اُس کے جنرل نے ایک خاص مقام پر قبضہ کرنے کا حکم دیا ہو"

یہاں بھی عقل وفہم کے خلاف نمایاں رجحان پایا جاتا ہے لیکن بنیادی نکتہ اقبال کے نظریہ سے مختلف ہے اقبال جذباتی زندگی کو نمایاں حیثیت دیتے ہیں جس میں عقل کوئی کردار ادا نہیں کرسکتی ۔ محمد اسد کے خیال میں پیغمبر ایک جنرل کی طرح ہے جو احکامات بغیر وضاحت کے جاری کرتا ہے ۔ یہ مثال بے ربط ہے ۔ تمام قرآن اس قسم کے واقعات سے بھرا ہوا ہے جہاں دیئے گئے احکامات کی وجوہ بیان کی گئی ہیں ۔ بہت سے مسلمان مفکروں کی یہ دلیل ہے کہ پیغمبر کی محض اس لئے فرمانبرداری کی گئی کیونکہ پیروکاروں کو ان کی صداقت اور اخلاق کی مضبوطی پر واضح اعتماد تھا ۔ لیکن اکثر یہ بات بھلادی جاتی ہے کہ لوگوں کو ان کی عقل واستدلال پر بھی اعتماد تھا ۔

تتمہ (CONCLUSION)

ہم دیکھ چکے ہیں کہ تمام جدید مسلم مصلحین اسلامی معاشرے میں انقلابی اصلاحات کی ضرورت سے بخوبی واقف ہیں ۔ وہ عقائد کی سادگی اور خالص اسلام کی طرف پلٹنا چاہتے ہیں ۔ اس مقصد کے لئے وہ کائنات کا ایسا نظریہ پیش کرتے ہیں جس میں آدمی اندھی قسمت کا قیدی ہونے کے بجائے اپنی قسمت پر قابو پانے کا ایک کارآمد ایجنٹ ہے ۔ وہ دنیا کو علت ومعلول کا ایک نظام قرار دیتے ہیں جس میں آدمی صحیح ذرائع سے اپنی خواہش کے مطابق نتائج اور تبدیلیاں لاسکتا ہے اس سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ خدائے تعالیٰ اس دنیا میں بے جا دخل اندازی نہیں کرتا اور نہ ہی کوئی عجیب وغریب واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں ۔ چنانچہ معجزات کو یا تو رد کردیا گیا ہے یا اصولِ عقل کے مطابق واضح کیا گیا ہے ۔ بہرحال وہ خدا کی قدرتِ کلی کو بھی قائم رکھنا چاہتے ہیں اس لئے یا تو وہ کہتے ہیں

کہ خالقِ کائنات اپنی تخلیق کا پابند نہیں ہے یا یہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ خاص موقعوں کے لیۓ خاص قوانین بناسکتا ہے مسلمان مصلحین معاشرے کی تعمیرِ نو میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں بس وہ سماجی نظام کو فرد سے جو لسے بناتا ہے نمایاں طور پر الگ رکھتے ہیں معاشرے میں دلچسپی انہیں صوفی اخلاقیات اور دینیات کو رد کرنے پر متوجہ کرتی ہے ۔صوفی اخلاقیات معاشرے کی برائیوں سے لاپروائی اور غیر مستعدی سکھاتی ہے صوفی صرف فرد کی اصلاح چاہتے ہیں وہ تعمیرِ معاشرہ یا صرف معاشرے کو نظرانداز کردیتے ہیں وہ فرد کی زندگی پر سماجی نظام کی ساخت اور اس کے اثرات کے متعلق بالکل نہیں سوچتے ۔

تقلید کے خلاف ردِّ عمل ایک اور مسئلہ ہے ۔خالص اسلام اسی وقت بحال کیا جاسکتا ہے جب ازمنہ وسطیٰ کے اعتقادات کی زنجیریں توڑدی جائیں۔ پس مسلم مصلحین اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اسلام عقلی واستدلالی عقائد اور اخلاقیات کا ایک نظام ہے جو اپنے پیروکاروں کو غور وفکر کرنے اور استدلالی عمل کی ترغیب دیتا ہے تقلید کی مخالفت کے نتیجے میں مذہبی امور میں عقل کے کردار پر زور دیا گیا لیکن ایک مسلسل اندیشہ بھی پیدا ہوگیا کہ اگر عقل کا صحیح استعمال نہ کیا گیا تو یہ ایمان کو خطرے میں ڈال دے گا ۔نتیجتاً عقل واستدلال پر زور دینے کے ساتھ ساتھ کچھ تجدد پسندوں نے اس کے خلاف رجحان کا اظہار کیا۔ وہ یا تو عقل کی اہمیت کو کم کردیتے ہیں یا اس کے دائرے کو محدود کردیتے ہیں، یہ رجحان غیر اسلامی ہے، اسلام وحی اور عقل کے درمیان کوئی مخالفت پیدا نہیں کرتا ۔پیغمبر وحی کو اس دنیا میں پہنچانے کے منفعلانہ ذرائع نہیں تھے وہ ربانی عقل کے فاعلانہ مظہر تھے ۔خدا نے صرف اعلیٰ ترین ذہن واستدلال کے حامل انسانوں کو پیغمبری کے لیۓ منتخب کیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وحی اور پیغمبری عقل وفراست میں کوئی عضوی تعلق ہے اگرچہ ہم اس تعلق کی نوعیت کو صاف طور پر بیان نہیں کرسکتے ۔پھر اگر اسلام ذاتی عقائد اور اخلاقیات کے چند اصولوں کا ایک نظام ہوتا جو آپس کے تعلقات پر اثر ڈالتا تو ہم آسانی سے عقل کو برطرف کردیتے لیکن چونکہ اسلام زندگی کا ایک مکمل لائحہ عمل ہے اس لیۓ یہ عقلی صلاحیت کو مشکل سے ہی دبا سکتا ہے پھر اسلامی اصول حقیقی زندگی میں جو زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے استعمال کرنے پڑتے ہیں ۔غرض پیغمبر کو ایک فوجی جنرل کی حیثیت میں بیان کرنا بے معنی ہے کیونکہ پیغمبر کے احکام ایک خاص موقع یا حالت کے لیۓ مقرر نہیں ہوتے بلکہ وہ تمام وقتوں اور تمام مواقع پر رہنمائی کرتا ہے ۔پس عقل یہ فیصلہ کرے کہ ایک خاص وقت میں ایک خاص حالت کس بات کا مطالبہ کرتی ہے اور صرف عقل ہی اس بات کا فیصلہ کرسکتی ہے کہ ایک خاص موقع پر پیغمبر کے معیاری ذہنی تصورات کو کس طرح پُراثر عملی شکل دی جاسکتی ہے ۔